پتلا ہے۔ دیکھیں یہ سر کبھی جھکتا ہے یا نہیں۔

(۵)

پورنماشی کا پورا چاند سر جو کے سنہرے فرش پہ ناچتا تھا اور لہریں خوشی سے گلے مل مل کر گاتی تھیں۔ یہ پھاگن کا مہینہ تھا۔ پیڑوں میں کونپلیں نکلی تھیں اور کوئل کوکنے لگی تھی۔

میں اپنا دورہ ختم کرکے صدر لوٹتا تھا۔ راستہ میں کنور سجن سنگھ کے فیضِ صحبت کا اشتیاق مجھے ان کے در دولت تک لے گیا جو اب میرے لیے خانہ بے تکلف تھا۔

میں شام کے دریا کی سیر کو چلا۔ وہ ہوائے جان پرور وہ درخشاں لہریں۔ وہ روحانی سکوت۔ سارا منظر ایک دلآویز پر مزہ خواب تھا۔ چاند کے نغمہ درخشاں سے جس طرح لہریں جھوم رہی تھیں۔ اسی طرح فکر شیریں سے دل امڈ آتا تھا۔

مجھے اونچے کڑاڑے پر ایک درخت کے نیچے کچھ روشنی نظر آئی۔ میں اوپر چڑھا۔ وہاں برگد کے گھنے سایہ میں ایک دھونی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک سادھو پیر پھیلائے۔ برگد کی ایک موٹی جٹا کے سہارے لیے ہوئے تھے۔ ان کا نورانی چہرہ آگ کی چمک کو لجاتا تھا۔ نیلے تالاب میں کنول کھلا ہوا تھا۔

ان کے پیروں کے پاس ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ وہ اس سادھو کے پیروں پر اپنا سر رکھے

ہوئے تھا۔ قدموں کو چومتا تھا اور آنکھوں سے لگاتا تھا۔ سادھو اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ گویا ہوس صبر اور قناعت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ بھولا لڑکا ماں باپ کی گود میں آبیٹھا تھا۔

دفعتہً وہ سر پُرخم اُٹھا اور میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی مجھے سکتا سا ہوگیا۔ یہ کنور سجن سنگھ تھے۔ وہ سر جو خم ہونا نہ جانتا تھا۔ اس وقت زمین بوس تھا۔

وہ ماتھا جو ایک اعلیٰ منصب دار کے سامنے نہ جھکا جو ایک باثروت اور بااختیار مہاراجہ کے سامنے نہ جھکا۔ جو ایک باکمال قوم پرست شاعر اور فلاسفر کے سامنے نہ جھکا۔ اس وقت ایک سادھو کے قدموں پر گرا ہوا تھا۔ غرور، ترک اور استغناء کے سامنے سرنگوں ہوگیا تھا۔

میرے دل میں اس عبرت ناک نظارہ سے عقیدت کا ایک ولولہ پیدا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا اور کنور سجن سنگھ کا روحانی مرتبہ دکھائی دیا۔ میں کنور صاحب کی طرف چلا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن میں ان کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا "میرے دوست! میں آج تک تمہاری روحانی عظمت سے بالکل بے خبر تھا۔ آج تم نے میرے دل پر نقش کر دیا کہ جاہ اور ثروت، کمال اور شہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں۔ نفس کے نازبردار اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرق نیاز جھکائیں۔

ترک اور تسلیم ہی وہ علوی صفات ہیں جن کے آستانہ پر حشمت اور جاہ سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو جاہ و حشم کو بادۂ غرور کے متوالوں کو اور تاج مرصع کو اپنے قدموں پر گرا سکتی ہے۔ اے کنج خلوت میں بیٹھنے والی روحو! کہ تم دھنیہ ہو کہ غرور کے پتلے بھی تمہارے پیروں کی دھول کو ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔

کنور سجن سنگھ نے مجھے چھاتی سے لگا کر کہا "مسٹر واگلے آج آپ نے مجھے سچے غرور کی صورت دکھا دی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ سچا غرور سچی عبادت سے کم نہیں۔ یقین مانیے مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غرور میں بھی روحانیت کا باس ہو سکتا ہے۔ آج میرے سر میں غرور کا جو نشہ ہے وہ کبھی نہیں تھا۔

اصلاح

ڈرگا مالی ڈاکٹر عرفان علی بار ایٹ لا کے یہاں نوکر تھا۔ پانچ روپیہ تنخواہ تھی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کے لیے گیہوں پیس دیا کرتی تھی۔ دو بچے جو ذرا ذی شعور تھے۔ اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اُپلے وغیرہ چن لاتے تھے۔ مگر تاہم ان کی بڑی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ درگا ڈاکٹر صاحب کی نظر بچا کر باغیچہ سے پھول چن لیا کرتا۔ اور بازار میں پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دست غنیمت پھلوں پر بھی جا پڑتا تھا۔ یہ اس کی بالائی آمدنی تھی۔ اس سے روزانہ نمک تیل کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے اضافۂ تنخواہ کی التجا کی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اضافہ کی کوئی معقول وجہ نہ آتی تھی۔ وہ صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ بھئی میں تمہیں جبراً تو نہیں روکتا۔ تمہارا یہاں نباہ نہیں ہوتا۔ کہیں اور

تلاش کرو۔ میرے لیے مالیوں کا خط انہیں ہے۔ دُرگا میں اتنی جرأت نہ تھی۔ کہ وہ لگا ہوا روزگار چھوڑ کر دوسری نوکری ڈھونڈنے نکلتا۔ اس سے زیادہ تنخواہ ملنے کی اسے امید بھی کم تھی۔ اس لیے درویش برجانِ درویش پڑا دن کاٹتا تھا۔ اور اپنی تقدیر کو روتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو باغبانی کا خاص ذوق تھا۔ انواع واقسام کے پھول پتے لگا رکھے تھے۔ اچھے اچھے پھلوں کے درخت ملیح آباد، سہارن پور، دربھنگہ وغیرہ مقامات سے منگوا کر لگائے تھے۔ درختوں کو پھل سے لدا ہوا دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہوتی تھی۔ اپنے احباب کے یہاں اکثر گلدستے اور سبزیاں وغیرہ تحفتہً بھجواتے رہتے تھے۔ انہیں خود کھانے کا شوق نہ تھا۔ مگر کھلانے میں دوستوں کی دعوت اثمار کرتے۔ پکنک پارٹیاں ان کے مشغلۂ تفریح کا ایک خاص جزو تھیں۔

ایک بار گرمیوں میں انہوں نے اپنے کئی اہم مشرب دوستوں کو آم کی دعوت دی۔ ایک ملیح آبادی سفیدے میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ انہیں وہ روزانہ چہل قدمی کرتے وقت دیکھا کرتے تھے۔ اس خیال سے انہیں وہی خوشی ہوتی تھی۔ جو کسی پہلوان کو اپنے پٹھوں کے کرتب دکھانے سے ہوتی ہے۔ اتنے بڑے خوش رنگ پھل خود ان کی نگاہ سے کبھی نہ گزرتے تھے۔ پھلوں کی شیرینی کا انہیں اتنا کامل یقین تھا۔ کہ وہ چکھ کر اپنا اطمینان کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس خودپروری سے وہ اپنے کسی ایک دوست کو لطف ذائقہ سے محروم کر دیں گے۔

شام کا وقت تھا۔ چیت کا مہینہ۔ احباب باغیچہ میں آکر حوض کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے، برف اور دودھ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پہلے

پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے دکھلا کر تب انہیں توڑوانا چاہتے تھے۔ تاکہ کسی کو یہ شک کرنے کا موقع نہ ملے کہ پھل اس باغ کے نہیں ہیں۔ جب سب حضرات جمع ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا: "آپ لوگوں کو تکلیف تو ہو گی۔ مگر ذرا چل کر پھلوں کو درخت میں لگے ہوئے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ گلاب میں بھی ایسی دلاویز سرخی نہ ہو گی۔ رنگ سے ملاحت ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کی رنگت اور صورت اس درجہ سے رغبت انگیز ہے۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ قلم خاص بلخ آباد سے منگوایا تھا۔ اور اس کی خاص طور پر نگہداشت کی گئی ہے۔

احباب اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب میزبان کی حیثیت سے آگے آگے چلے۔ روشوں کی دونوں طرف گلاب کے تختے تھے۔ ان کی بہار دکھلاتے ہوئے وہ بالآخر سفیدہ کے درخت کے سامنے آگئے۔ مگر وہاں ایک پھل بھی نہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ شاید یہ درخت نہیں ہے۔ دو قدم اور آگے چلے۔ دوسرا درخت مل گیا اور آگے بڑھے۔ کٹھل کا درخت آگیا۔ پھر پیچھے لوٹے۔ اور تعجب کرتے ہوئے سفیدہ کے درخت کے سامنے رک گئے۔ پھل کیا ہوئے؟ درخت تو یہی ہے۔ اس میں مطلق شبہ نہیں۔ مگر پھل کہاں گئے؟ دوستوں کی طرف خطا وارانہ انداز سے دیکھا اور معافی طلب لہجے میں بولے۔ "ضرور مالی کی شرارت ہے۔ دیکھئے میں کم بخت کو ابھی بلاتا ہوں۔ میں حد درجہ نادم ہوں۔ کہ آپ صاحبوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ واللہ مجھے اس وقت جتنا ملال ہے۔ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ایسے خوش ذائقہ، خوش رنگ، خوشنما پھل میں نے اپنی

زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ ان کے یوں تلف ہوتے کا مجھے بے انتہا قلق ہے۔"
یہ کہتے ہوئے وہ ایک انداز شہادت سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ احباب نے کہا "جناب آپ ہم لوگوں کی تکلیف کا خیال نہ فرمائیں، وہ نہ سہی۔ دوسرے پھل سہی"۔ ایک رنگین طبع صاحب بولے۔ جناب مجھے تو سب آم ایک ہی سے لگتے تھے۔ سفیدے، موہن بھوگ، لنگڑے، بمبئی فجری، دسہری اس میں کوئی فرق معلوم ہوتا۔ معلوم نہیں کیونکر آپ لوگوں کو ان کی لذتوں میں امتیاز معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا "یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔ اس وقت جو موجود ہوں۔ وہی منگوائیے۔ جو گئے ان کا افسوس بے سود ہے"۔

عرفان علی "حضرت آم کی کیا کمی ہے سارا باغ بھرا ہوا ہے۔ خوب شوق سے کھائیے۔ مگر وہ لطافت اور نزاکت کہاں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ وہ ان سفیدوں پر ایسا نکھار تھا کہ بالکل سیب معلوم ہوتے تھے۔ سیب خوشنما ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں وہ رغبت انگیز لطافت کہاں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ شجر آرزو میں وصال کے پھل لگے ہوئے ہیں۔ واللہ سخت افسوس ہے، کمال افسوس ہے۔ اس مالی نے آج وہ حرکت کی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ نمک حرام کو گولی مار دوں۔ اس وقت سامنے آجائے تو ادھ موا کر دوں، (مسکرا کر) اگر خدانخواستہ کل مجھ پر ضرب شدید کا کوئی استغاثہ ہو تو آپ لوگ شاہد رہیے گا۔ کہ مجھے کس قدر روحانی اشتعال ہوا ہے۔

مالی کا پتہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سائیس سے آم نڑوائے، دوستوں نے

آم کھائے۔ دودھ پیا۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے نقصانِ عظیم کا مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہیں حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے مالی کے انتظار میں قطب از جائے جنبد بنے بیٹھے رہے

(۳)

دُرگا شام کو بازار سے لوٹا۔ وہ چوکنی نظروں سے اِدھر اُدھر تاکتا آتا تھا۔ جونہی اس نے ڈاکٹر کو حوض کے کنارے ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ سمجھ گیا، کہ چوری پکڑ لی گئی۔ اس خوف سے آج اس نے آنے میں عمداً دیر کی تھی اس نے سمجھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہیں سیر کرنے گئے ہوں گے۔ میں کٹھل کے درخت کے نیچے اپنے جھونپڑے میں جا بیٹھوں گا۔ صبح کو پوچھ پاچھ ہوئی بھی تو مجھے صفائی دینے کا موقع رہے گا۔ سرکار میری تلاشی لے لیں۔ اس طرح معاملہ دب جائے گا۔ چور وقت کو اپنی بریت کی بہترین دلیل سمجھتا ہے۔ ایک ایک لمحہ اسے دلیر بناتا جاتا ہے۔ لیکن رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑے جانا اس کے لیے تہر ہے۔ وہ بے زبان ہو جاتا ہے۔ اس کی سینہ زوری سلب ہو جاتی ہے۔ خون کے سوکھے رنگ کے داغ بن سکتے ہیں لیکن تازہ خون آپ ہی آپ پکارتا ہے۔ دُرگا کے پیر تھم گئے۔ سینہ دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اس پر پڑ گئی تھی۔ اب واپسی کا ارادہ بے کار تھا۔ ڈاکٹر صاحب دور سے دیکھتے ہی اُٹھے۔ کہ چل کر خوب مرمت کروں لیکن بیرسٹر تھے۔ خیال آگیا کہ اس کا بیان لینا ضروری ہے۔ اشارہ سے قریب بلایا۔ اور پوچھا "سفیدہ میں کئی پھل لگے ہوئے تھے۔ ان میں ایک بھی نظر نہیں آتا، کیا ہوئے؟" دُرگا نے معصومانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ "ہجور ابھی بجار گیا ہوں تو آم جوں کے توں تھے۔ اتنی دیر میں کوئی

توڑے گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔

عرفان علی۔ تمہارا کس پر شبہ ہے؟

مالی۔ ہجور اب میں کیسے بتاؤں؟ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ نہ جانے کس کی نیت بگڑی ہو۔

عرفان علی۔ مگر میرا شبہ تمہارے ہی اوپر ہے۔ اگر توڑ کر رکھے ہوں تو لا کر دے دو۔ یا صاف صاف کہہ دو۔ کہ میں نے توڑے ہیں۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔

چور خص سزا سے نہیں بچنا چاہتا۔ وہ بدنامی سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ وہ سزا سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا بدنامی سے۔ جب اسے سزا سے بچنے کی ساری امید منقطع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے جرم کا اقبال نہیں کرتا۔ دُرگا اس وقت اپنے فعل کا اعتراف کر کے سزا سے بچ سکتا تھا۔ پر اس نے کہا، ہجور مالک ہیں جو چاہیں کریں پر میں نے آم نہیں توڑے۔ سرکار ہی بتا دیں۔ کہ اتنے دن آپ کی تابعداری کرتے ہو گئے۔ کبھی ایک ٹہنی بھی چھوٹی ہے؟"

عرفان علی۔ تم قسم کھا سکتے ہو؟

دُرگا۔ ہجور گنگا کی قسم جو میں نے آموں میں ہاتھ بھی لگایا ہو۔

عرفان علی۔ اس قسم کی سند نہیں۔ تم لوٹے میں پانی لاؤ۔ اس میں تلسی کے پتے رکھو۔ اور تب قسم کھا کر کہو۔ کہ اگر میں نے آم توڑے ہوں۔ تو میرا لڑکا میرے کام نہ آئے تب مجھے تمہارے اوپر اعتماد ہو گا۔

دُرگا۔ ہجور سانچ کو آنچ کیا۔ جیسے کہئے قسم کھا جاؤں۔ جب میں نے کام ہی

نہیں کیا۔ تب مجھ پر قسم کیا پڑے گی؟

عرفان علی۔ باتیں نہ بناؤ، جا کر پانی لاؤ۔

ڈاکٹر صاحب قیافہ شناس آدمی تھے۔ رات دن مجرموں سے سابقہ رہتا تھا درگا اگرچہ زبان سے دلیرانہ باتیں کر رہا تھا۔ پر اس کے دل میں خوف سمایا ہوا تھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں آیا۔ لیکن لوٹے میں پانی لے کر پھر جانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ کئی ایسے واقعے یاد آ گئے۔ جب کہ جھوٹی گنگا اٹھانے والوں پر آسمانی بلائیں نازل ہو گئی تھیں۔ بھگوان کے حاضر و ناظر ہونے کا ایسا یقین آج تک اسے نہ ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ میں جھوٹی گنگا نہ اٹھاؤں گا۔ یہی ہوگا۔ نا کہ برخاست ہو جاؤں گا۔ کچھ جرمانہ ہو جائے گا۔ یہ منظور ہے۔ نوکری بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ اور نوکری نہ بھی ملے تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی ہے۔ کدال بھی چلاؤں گا۔ تو چار پانچ آنے روز پا جاؤں گا۔

وہ آہستہ آہستہ خالی ہاتھ ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے تند لہجہ میں کہا "پانی لاؤ"

درگا۔ حضور میں گنگا نہ اٹھاؤں گا۔

ڈاکٹر۔ تو ثابت ہو گیا، کہ تم نے ضرور آم توڑے۔

درگا۔ اب سرکار جو چاہیں سمجھیں۔ مان لیجیے میں نے ہی توڑ لیے تو آپ کا غلام ہوں۔ رات دن تابعداری کرتا ہوں۔ بال بچے آموں کے لیے روئیں تو کہاں جاؤں۔ اب کے جان بکسی کی جائے۔ پھر ایسی کھتا نہ ہو گی۔

ڈاکٹر صاحب اتنے فیاض نہ تھے۔ انہوں نے یہی احسان کیا۔ کہ درگا کو پولیس کے

سپرد نہ کیا اور نہ اسے ہنٹر لگائے، اس کے مذہبی اعتقاد نے انہیں کچھ نرمی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ مگر ایسے بدنیت شخص کو اپنے یہاں رکھنا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے دم درگا کو معزول کر دیا۔ اور اس کی باقی تنخواہ جرمانہ میں ضبط کر لی۔

(۳)

کئی ماہ گزرنے کے بعد ایک روز ڈاکٹر عرفان علی مسٹر پریم شنکر کے باغیچہ کی سیر کرنے گئے۔ وہاں سے چند اچھی اچھی قلمیں لانے کا ارادہ تھا۔ پریم شنکر کو بھی باغبانی کا شوق تھا اور دونوں آدمیوں کے درمیان یہی ایک مناسبت تھی۔ ورنہ دونوں بالکل متضاد تھے۔ پریم شنکر قناعت پسند، سادہ مزاج غریب دوست آدمی تھے۔ وہ کئی سال امریکہ میں رہ چکے تھے۔ وہاں زراعت اور فلاحت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور اب یہاں آکر اسی فن کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ انسانی خاصہ اور موجودہ نظامِ معاشرت کے متعلق ان کے عجیب خیالات تھے۔ جن کے باعث شہر کے مہذب طبقہ کے لوگ انہیں مراقی فاتر العقل سمجھتے تھے ان کے خیالات سے لوگوں کو ایک قسم کی فلسفیانہ ہمدردی ضرور تھی۔ مگر اس میں لوگوں کو شک تھا کہ ان پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے، یہ عمل کی دنیا ہے۔ فلسفہ کی دنیا نہیں ہے۔ یہاں فلسفہ ہمیشہ فلسفہ ہی رہے گا۔ اسے واقعاتِ زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب باغیچہ میں داخل ہوئے تو پریم کو کیاریاں سینچتے ہوئے پایا۔ کنویں پر ایک سفید پوش آدمی کھڑا ایمپ سے پانی نکال رہا تھا۔ وہ دُرگا مالی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں اس وقت دُرگا کی جانب سے بُغض للہ سا پیدا ہوا۔ جس شخص کو انہوں سزا دے کر اپنے یہاں سے علیٰحدہ کر دیا تھا۔ اسے اس قدر خوش باش ہونے کا کیا حق تھا۔ اگر دُرگا اس وقت پھٹے حال، رونی صورت بنائے نظر آتا۔ اور انہیں دیکھتے ہی ان کے سامنے

ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ تو شاید ڈاکٹر صاحب کو اس پر رحم آجاتا وہ اسے غالباً کچھ انعام دیتے اور پریم شنکر سے اس کی نسبت چند کلماتِ خیر کہنے کی تکلیف گوارا کرتے وہ خاصتہً نیک آدمی تھے۔ اور اپنے ملازموں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر ان کی اس مہربانی اور اس التفات میں مطلق فرق نہ تھا جو انہیں کتوں یا گھوڑوں کے ساتھ تھی۔ اس مہربانی کی بنیاد انصاف پر نہیں رحم پر تھی۔ درگا نے انہیں دیکھا۔ کنوئیں پر کھڑے کھڑے ادب سے سلام کیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی یہ خودداری ڈاکٹر صاحب کے جگر میں کانٹے کی طرح چبھی۔ انہیں اس خیال سے غصہ آیا کہ میرے یہاں سے نکلنا اس کے حق میں اکسیر ہو گیا۔ پریم شنکر جوں ہی ان سے مصافحہ کر کے انہیں چند نئے تختوں کی طرف لے چلے تو ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ "یہ آدمی آپ کے یہاں کتنے دنوں سے ہے؟"

پریم شنکر۔ چار پانچ مہینے ہوئے ہوں گے۔

عرفان علی۔ کچھ نوچ کھسوٹ تو نہیں کرتا۔ اس سے پہلے یہ میرے یہاں مالی تھا۔ اس کی دست درازیوں سے تنگ آکر میں نے اُسے نکال دیا تھا۔ کبھی پھول توڑ کر بیچ لیتا۔ اور کبھی پودے اکھاڑ کر لے جاتا اور پھولوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بار میں نے چند احباب کی دعوت کی تھی۔ ملیح آبادی سفیدہ خوب پھلا ہوا تھا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے اور میں درخت کے پاس گیا تو سارے پھل غائب کچھ نہ پوچھئے، اس وقت کتنی خفت ہوئی۔ میں نے اسی وقت ان حضرات کو دھتکار بتائی۔ بڑا ہی دغاباز بد نیت آدمی ہے۔ اور ایسا شاطر۔ کہ اسے گرفتار کرنا محال ہے۔ کوئی وکیل ہی جیسا کایاں آدمی ہو تو اسے پکڑ سکتا ہے۔ ایسی صفائی اور دلیری سے انکار کرتا ہے کہ اس کا منہ

تکتے رہ جایئے، آپ کو تو کبھی چرکا نہیں دیا؟

پریم شنکر۔ جی مطلق نہیں، مجھے اس نے شکایت کا کبھی موقعہ نہیں دیا۔ یہاں تو خوب محنت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کی چھٹی میں بھی آرام نہیں کرتا۔ مجھے تو اس پر اتنا بھروسہ ہوگیا ہے۔ کہ سبزی، پھل، پودے، بیج سب اسی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیئے ہیں۔ دن بھر کو جو آمدنی ہوتی ہے۔ وہ شام کو مجھے دے دیتا ہے۔ اور کبھی ایک پائی کا بھی فرق نہیں ہوتا۔

عرفان علی۔ جناب یہی تو اس کی مشتاقی کی تعریف ہے کہ آپ کو اُلٹے استرے سے مونڈے اور آپ کو خبر نہ ہو، آپ اسے کیا تنخواہ دیتے ہیں۔

پریم شنکر۔ یہاں کسی کو تنخواہ نہیں دی جاتی۔ سب آدمی نفع میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ مہینہ میں ضروری اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے۔ اس پر دس فیصدی کارِ خیر کے لیے الگ کرلیا جاتا ہے۔ باقی روپے برابر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ ۴۰ روپے کی آمدنی ہوئی تھی۔ مجھے ملا کر کل سات آدمی ہیں۔ ہر ایک کے حصّہ میں بیس بیس روپے آئے تھے۔ اب کی ماہ میں جوار ہوگئی ہے۔ اسر دو اچھے آئے ہیں۔ زیادہ آمدنی کی اُمید ہے۔

عرفان علی نے تعجّب سے پوچھا "کیا آپ اس قدر قلیل آمدنی پر بسر کر لیتے ہیں؟"

پریم شنکر۔ جی ہاں بہت آسانی سے۔ میں ان مصنوعی ضروریات کا پابند نہیں ہوں جسے آج کل داخل تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ میں وہی کپڑے پہنتا ہوں، وہی کھانا کھاتا ہوں۔ اور اسی طرح رہتا ہوں۔ زیادہ کی ضرورت ہی کیوں ہو؟ دس بیس روپے ماہوار ادویات کا صرفہ ہے جو غربا کو تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ رقم مشترکہ آمدنی سے وضع

کی جاتی ہے۔ اور سب کے سب آدمی اس ثواب میں شریک ہوتے ہیں۔ سائیکل جو آپ کو نظر آرہی ہے وہ مشترکہ رقم سے لی گئی ہے۔ جسے ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر سوار ہوتا ہے۔ چونکہ ان آدمیوں کو مجھ پر زیادہ اعتبار ہے۔ اس لیے وہ مجھے اپنا مکھیا سمجھتے ہیں۔ اور میرے علم و تجربہ کے باعث میرا دباؤ مانتے ہیں۔ جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا۔ کہ میں کسی کا نوکر ہوں۔ سب کے سب ساجھے دار ہیں۔ اس لیے سب جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔ اور کامل ایمانداری کے ساتھ جب ایک شخص مالک اور دوسرا اس کا نوکر ہوتا ہے۔ تو فوراً رقابت شروع ہو جاتی ہے۔ مالک چاہتا ہے۔ کہ میں اس محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کروں۔ نوکر چاہتا ہے کہ جہاں تک ہو کم سے کم کام کروں۔ ان کے درمیان ذرا بھی ہمدردی یا برادرانہ تعلق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس رقیبانہ کش مکش کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا میں دولت اور افلاس کے دو جُدا جُدا فرقے ہیں۔ اور ان میں خونریز جنگ ہو رہی ہے۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ رقابت کا دور اب نزع کی حالت میں ہے۔ اس کی جگہ اب باہمی امداد اور ہمدردی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ میں نے دوسرے ملکوں میں رقابت کے نظارے خوب دیکھے ہیں اور ان سے سیر ہو گیا۔ باہمی امداد میں نجات کی صورت نظر آتی ہے۔ اب ہمیں زبردستی کو خیرباد کہہ کر ایثار سے کام لینا پڑے گا۔

مسٹر قربان علی۔ تو یہ کہیے کہ آپ سوشلسٹ ہیں۔

پریم شنکر۔ جی نہیں میں سوشلسٹ یا اور کچھ نہیں ہوں۔ میں صرف حق اور انصاف کا خادم ہوں۔ میں اخلاق کو علم سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ علم اور ذہانت

فہم و فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہتا ۔ مجھے موجودہ تعلیم اور تہذیب پر مطلق اعتماد نہیں ہے ۔ علم کا کام ہے ۔ تہذیب اخلاق اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی ، فراخدلی ، ایثار ، بے نفسی ، ہمدردی ، غریب دوستی ، اور انصاف پسندی ہے ۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت و جاہ کا غلام بنا دے جو ہمیں زیردست آزادی پر مائل کرے ۔ جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک دے ۔ تعلیم نہیں شیطنت ہے ۔ جہلا حرص و طمع کے بس ہو جائیں ۔ تو قابلِ معافی ہیں ۔ مگر مدعیانِ علم و تہذیب کے لیے نفس پرستی حد درجہ شرمناک ہے ۔ علم و فضیلت کو ہم نے بامِ ثروت کا زینہ بنا لیا ۔ حالانکہ وہ خدمت کا وسیلہ تھا ۔ اونچی سے اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں ۔ بس زر پرستی ہماری تعلیم و تہذیب کا معیار ہے ۔ میں اس تعلیم سے جہالت کو بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں ۔ ہمارے پروفیسر صاحب ایک ہزار سے کم تنخواہ پائیں ، تو ان کا منہ نہیں سیدھا ہوتا ۔ ہمارے دیوانی اور مال کے حکام دو ہزار ماہوار تنخواہ پانے پر بھی شکوۂ تقدیر کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مریض ہو جائے ۔ اور میں سونے کی دیوار کھڑی کر لوں ۔ اور ہمارے وکیل صاحب (معاف کیجئے گا) اپنی قانون دانی کو ہیرے کے تول بیچنا چاہتے ہیں ۔ سب کے سب "وقت دولت ہے" کے کلیہ کے غلام بنے بیٹھے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک سینکڑوں ، ہزاروں آدمیوں کی روزی غصب کر لیتا ہے ۔ اور پھر بھی خادمِ قوم بننے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ رعایا فاقہ کشی کرے ، یہ بہتر ہے ، خواہ فاقوں سے مرے ، ہمارا دماغی گروہ ٹس سے مس نہیں ہوتا ۔ پیدا دوسرے کریں کھانا ہمارا کام ہے ۔ میں اس گروہ کو محض وجودِ معطل نہیں بلکہ شرِ دائر سمجھتا ہوں ۔

ڈاکٹر عرفان علی نے بہت تحمل سے کام لے کر پوچھا "تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم سب مزدوری کریں"۔

پریم شنکر - جی نہیں، اگر ایسا ہو تو میں اسے نوعِ انسان کے لیے مایۂ خیر و برکت سمجھوں۔ مجھے صرف حالات میں اس درجہ تفاوت سے اعتراض ہے۔ اگر ایک غریب آدمی پانچ روپے ماہوار میں گزار سکتا ہے تو ایک دماغی کام کرنے والے آدمی کے لیے اس کی دگنی چوگنی رقم کافی ہونی چاہیے۔ مگر پانچ اور پانچ ہزار، پچاس اور پچاس ہزار کا بعد المشرقین کیوں ہو؟ انتظامِ سلطنت قانونی فیصلہ، قانون کی حمایت طبابت، تصویر کشی، رقاصی معلمی، دلالی، تجارت اور صدہا دیگر پیشے ایسے ہیں۔ جن میں ایک بھی کسبِ دولت نہیں کرتا۔ ان سب کا مدار دوسروں کی کمائی پر ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ پیشے جو ضروریاتِ زندگی پیدا کریں۔ قیامِ حیات کے لیے سامان بہم پہنچائیں۔ آج دنیا کے سارے مدبّر، سارے وکیل، سارے دلال، سارے پروفیسر معرضِ فنا میں آجائیں۔ تو دنیا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرائے گی۔ بلکہ خوشی سے گھی کے چراغ جلائے گی۔ اس کے سر سے ایک بوجھ اُتر جائے گا، کاشت کار اپنا ہل چلائے گا۔ اور اپنے گوشۂ قناعت اور عافیت میں بیٹھا ہوا آرام سے زندگی بسر کرے گا۔ آپ فرمائیں گے۔ یہ تو تمدّن کے دورِ اوّلین کا نقشہ ہے۔ انسان نے قرنوں اور صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ ان کو ہٹا کر پھر اسی دورِ توحش کی طرف واپس جاتا ہے۔ آپ فنونِ لطیفہ کی ترقی کو انسان کے جذباتی اور روحانی عروج کا لازمہ قرار دیں گے۔ علیٰ ہذا آپ کو موجودہ تہذیب کا ہر ایک پہلو حیاتِ انسانی کے لیے ضروری نظر آئے گا۔ کیونکہ انسان محض چوپایہ نہیں ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب اور ترقی خود غرضی

اور جفاشعاری کی ایک مستور صورت ہے اور کچھ نہیں ہے۔ ہندوستان کا کاشتکار چین کے مزارع سے لڑنے نہیں جاتا۔ اسی تعلیم یافتہ گروہ نے اپنے مطلب کے لیے قوم کا سوانگ کھڑا کیا۔ قومی حقوق کی حفاظت کے لیے فوجیں بنائیں۔ انصرام سلطنت کا نقشہ کھینچا۔ مسائل بین الاقوام کی ایجاد، تجارت اور صنعت کے لایحل عقدے اختراع کیے۔ اور اب اپنی فتوحات پر ناز کرتا ہے۔ اپنی تہذیب پر پھولا نہیں سماتا۔

عرفان علی۔ آپ اقتصادیات کے مسئلہ پر تقسیم محنت کو بالکل نظر انداز کر رہے قدرت نے افراد کو خاص خاص قابلیتیں عطا کی ہیں۔ ان کے بہترین استعمال کے لیے خاص موقعوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پریم شنکر۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ ہر فرد مزدوری کرنے پر مجبور ہو۔ نہیں جیسے پرماتما نے غور و فکر کی قوت عطا کی ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق کرے، جس کے جذبات مضبوط اور عمیق ہوں۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرے۔ علیٰ ہذا میری دلیل صرف یہ ہے کہ پیشوں میں اس قدر امتیاز نہ رہنا چاہیے۔ دماغ سے تعلیم و تہذیب اور درس و تدریس کا کام لینا چاہیے۔ جذبات سے روحانی اور اخلاقی اصلاح کا۔ مگر ان دماغی یا روحانی کمالات کو ذریعۂ ثروت نہ بنانا چاہیے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھوں سے کسب معاش کرے۔ اور دل و دماغ صرف قوم کی اصلاح و فلاح، روحانی مسائل کی تحقیق و تدقیق، علمی معلومات کی اشاعت اور ترویج کے لیے وقف ہوں۔ لیکن تاوقتیکہ ہم اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکیں۔ ہم کو ذہنی اور حرفتی پیشوں میں اس غیر فطری امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ آئین قدرت کے بالکل خلاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ لازمی پیشوں کو تفوق ہو بعض اہل الرائے

کا خیال ہے کہ اس تسویہ سے اہلِ کمال بد دل ہو جائیں گے۔ اور دنیا ان کے انوارِ فیض سے محروم ہو جائے گی۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے سے بڑے حکمار، بڑے سے بڑے شعراء، بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے ارباب فنونِ لطیفہ مال و زر سے بے نیاز تھے۔ اس وقت کمال کا معاوضہ اپنے قلب کی تسکین تھی۔ نوع کی ضرورت محرک کہاں تھی۔ جب سے کمال نے دولت کا دامن پکڑا۔ اسی وقت سے تہذیب کا انحطاط شروع ہوا۔

ڈاکٹر عرفان علی اب زیادہ صبر نہ کر سکے۔ بولے "آپ کا مجوزہ نظامِ معاشرت فرشتوں کی دنیا کے لیے چاہے موزوں ہو۔ لیکن اس عملی دنیا کے لیے اور اس عملی دور میں ہرگز موزوں نہیں ہے۔"

پریم شنکر۔ محض اسی لیے کہ ابھی تک سرمایہ داروں کا اور مہذب جماعت کا عوام پر اقتدار ہے؟ مگر اس کے قبل بھی بارہا اس اقتدار کو زک ہو چکی ہے اور قرائن بتلا رہے ہیں۔ کہ زمانہ قریب میں اب اسے پھر زک پہنچنے والی ہے۔ شاید اب کے یہ شکست فیصلہ کن ہو گی۔ تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہو کر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت رد سار کا اقتدار، سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اور اپنی آخری منزل تک آپہنچا ہے مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں۔ کہ ہم کو آثار و قرائن بالکل نہیں آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہنچ رہی ہیں۔ مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں۔ گویا عالم خواب میں ہوں۔ ہم اپنی یونیورسٹی ایجوکیشن۔ اپنے قانونی انہماک، اپنے ڈرامہ اور تھیٹر، اپنے تمل اور کارخانوں اور اسی

قسم کے دوسرے مشاغل میں محو ہیں۔ جس کا منشا دوسروں کی کمائی اور مشقت پر موٹا ہونا ہے۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب مہذب دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ ماہوار پیدا کرتا ہے۔ معاشرت کا ضروری جزو ہے۔ یا وہ غریب کندہ ناتراش کاشت کار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ دُرگا مالی ایک ڈالی میں کچھ پھل، چند جوار کی بالیں۔ چند آم سجا کر لایا۔ اس کے انداز اور بشرہ سے ایک خود دارانہ متانت برس رہی تھی۔ گویا اب وہ ذاتی اہمیت سے باخبر ہو گیا ہے۔ وہ سلام کر کے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ "آپ کو کن چیزوں کی قلمیں چاہئیں۔ آپ بابوجی کو آرڈر دیجیے۔ مَیں کل آپ کے مکان پر پہنچا دوں گا۔ بال بچے تو اچھی طرح ہیں؟"

عرفان علی نے کسی قدر محجوب ہو کر کہا۔ "ہاں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ تم یہاں آرام سے ہو؟"

دُرگا۔ جی ہاں۔ سب حضور کی مہربانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ پر چند قلموں کے نام لکھ کر رکھ دیئے۔ اور رخصت مانگی۔ پریم شنکر ان کے ساتھ ساتھ پھاٹک تک آئے۔ ڈاکٹر صاحب دروازہ پر متانت سے مسکرا کر کہا۔ "حضرت میں آپ کے اصولوں کا قائل تو نہیں ہوا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ایک کمینہ اور شیطان آدمی کو انسان بنا دیا۔ یہ آپ کی صحبت کا فیض ہے میں ذات کا قائل ہوں۔ انسٹی ٹیوشنوں کا قائل نہیں۔ لیکن معاف فرمائیے گا۔ میں پھر بھی کہوں گا۔ کہ اس سے ہوشیار رہیے گا۔ ایجوکیشن کا علم ابھی تک کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کر سکا۔ جو تخم کی تاثیر کو مٹا دے۔

آتما رام

(۱)

موضع بنید ویں مہادیو سُنا ایک نمایاں وجود تھا۔ وہ اپنے کھپریل کے بوسیدہ سائبان میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا صبح سے پہر رات ہتھوڑا لیے کھٹ کھٹ کیا کرتا تھا۔ اس صدائے پیہم کے لوگ اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب کسی وجہ سے یہ آوازیں بند ہو جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی چیز غائب ہو گئی ہے۔ وہ روز ایک بار صبح کو اپنے طوطے کا پنجرہ لیے کوئی بھجن گاتا ہوا تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اس وقت اندھیرے میں اس کی جھکی ہوئی کمر اور اس کا جسم نحیف دیکھ کر کسی اجنبی شخص کو اس پر شیطانی وجود کا دھوکا ہو سکتا تھا۔ اس کے یہ بھجن تعینِ وقت کے اعتبار سے صدائے مرغ کا کام دیتے تھے